مقالات

اِسلام اور جاھلیّت

[یہ مقالہ ۲۳ فروری ۱۹۴۱ء کو مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج پشاور کی دعوت پر پڑھا گیا تھا]

انسان کو دُنیا میں جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی معاملہ اُس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس چیز کی ماہیت و کیفیت اور اپنے اور اُسکے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرلے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے بجائے خود صحیح ہو یا غلط، مگر بہرحال اسے اِن اُمور کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنی ضرور پڑتی ہے۔ اور جب تک وہ کوئی رائے قائم نہیں کرلیتا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ مَیں اسکے ساتھ کیا طرزِ عمل اور کیا رویّہ (Attitude) اختیار کروں۔ یہ آپکا شب و روز کا تجربہ ہے۔ آپ جب کسی شخص سے ملتے ہیں تو آپکو یہ معلوم کرنیکی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ شخص کون ہے، کس حیثیت، کس مرتبے، کن صفات کا آدمی ہے اور مجھ سے اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔ اسکے بغیر آپ یہ طے کر ہی نہیں سکتے کہ آپکو اُسکے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوتا تو بہرحال آپکو قرائن کی بنا پر ایک قیاسی رائے ہی ان امور کے متعلق قائم کرنی پڑتی ہے اور جو رویّہ بھی آپ اُسکے ساتھ اختیار کرتے ہیں اسی رائے کی بنا پر کرتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کھاتے ہیں اُنکے ساتھ آپکا یہ معاملہ اسی وجہ سے ہے کہ آپ کے علم یا آپکے قیاس میں وہ چیزیں غذائی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ جن چیزوں کو آپ پھینک دیتے ہیں، جنکو آپ استعمال کرتے ہیں، جن کی آپ حفاظت کرتے ہیں،

جنکی آپ تعظیم یا تحقیر کرتے ہیں، جن سے آپ ڈرتے یا محبت کرتے ہیں، اُن سب کے متعلق آپ کے یہ مختلف طرزِ عمل اُسی رائے پر مبنی ہوتے ہیں جو آپ نے اُن چیزوں کی ذات و صفات اور اپنے ساتھ اُنکے تعلق کے بارے میں قائم کی ہے۔

پھر جو رائے آپ اشیاء کے متعلق قائم کیا کرتے ہیں اُسکے صحیح ہونے پر آپکے رویّہ کا صحیح ہونا اور غلط ہونے پر آپکے رویّہ کا غلط ہونا منحصر ہوتا ہے۔ اور خود اس رائے کی غلطی و صحت کا مدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ آیا آپ نے علم کی بنا پر رائے قائم کی ہے، یا قیاس پر، یا وہم پر، یا محض مشاہدۂ حسّی پر۔ مثلاً ایک بچہ آگ کو دیکھتا ہے اور مجرد مشاہدۂ حسّی کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ بڑا خوبصورت، چمکدار کھلونا ہے۔ چنانچہ اس رائے کے نتیجہ میں اُس سے یہ طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اسی آگ کو دیکھ کر وہم سے یا قیاس سے یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اسکے اندر الوہیت ہے، یا یہ الوہیت کا مظہر ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسکے ساتھ میرا رویّہ یہ ہونا چاہیے کہ میں اسکے آگے سرِ نیاز جھکا دوں۔ ایک تیسرا شخص اسی آگ کو دیکھ اسکی ماہیت اور اسکی صفات کی تحقیق کرتا ہے اور علم و تحقیق کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ پکانے اور جلانے اور تپانے والی ایک چیز ہے، اور میرے ساتھ اس کا تعلق وہ ہے جو ایک مخدوم کے ساتھ خادم کا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ آگ کو نہ کھلونا بناتا ہے نہ معبود، بلکہ اس سے حسبِ موقع پکانے اور جلانے اور تپانے کی خدمت لیتا ہے۔ اِن مختلف رویّوں میں سے بچے اور آتش پرست کے رویّے جاہلیت کے رویّے ہیں۔ کیونکہ بچے کی یہ رائے کہ آگ محض کھلونا ہے تجربے سے غلط ثابت ہو جاتی ہے اور آتش پرست کی یہ رائے کہ آگ خود الٰہ ہے یا مظہرِ الوہیت ہے کسی ثبوتِ علمی پر مبنی نہیں بلکہ محض قیاس و وہم پر مبنی ہے۔ بخلاف اسکے آگ سے خدمت لینے والے کا رویّہ علمی رویہ ہے کیونکہ آگ کے متعلق اُسکی رائے علم پر مبنی ہے۔

زندگی کے بنیادی مسائل

اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب فرد اپنی نظر کو جزئیات سے کلیات پر پھیلائیے۔ انسان اس دنیا میں اپنے آپکو موجود پاتا ہے۔ اسکے پاس ایک جسم ہے جس میں بہت سی قوتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے زمین و آسمان کی ایک عظیم الشان بساط پھیلی ہوئی ہے جس میں بیحد و حساب اشیاء ہیں اور وہ اُن اشیاء سے کام لینے کی قدرت اپنے اندر پاتا ہے۔ اسکے گرد و پیش بہت سے انسان، جانور، نباتات، جمادات وغیرہ ہیں اور ان سب سے اسکی زندگی وابستہ ہے۔ اب کیا آپکے نزدیک یہ متصور ہے کہ وہ ان چیزوں کے ساتھ کوئی رویہ اختیار کرسکتا ہے جب تک کہ پہلے خود اپنے بارے میں، ان تمام موجودات کے بارے میں، اور انکے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرے؟ کیا وہ اپنی زندگی کے لیے کوئی راستہ اختیار کرسکتا ہے جب تک یہ طے نہ کرلے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار، خود مختار ہوں یا ماتحت، ماتحت ہوں تو کس کا اور جواب دہ ہوں تو کس کے سامنے، میری اس دنیوی زندگی کا کوئی مآل ہے یا نہیں، اور ہے تو کیا ہے؟ اسی طرح کیا وہ اپنی قوتوں کے لیے کوئی مصرف تجویز کرسکتا ہے جب تک اس سوال کا فیصلہ نہ کرلے کہ یہ جسم اور جسمانی قوتیں اسکی اپنی ملک ہیں یا کسی کا عطیہ ہیں، اِن کا حساب کوئی لینے والا ہے یا نہیں، اور اِن کے استعمال کا ضابطہ اسے خود متعین کرنا ہے یا کسی اور کو؟ اسی طرح کیا وہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء کے متعلق کوئی طرزِ عمل اختیار کرسکتا ہے جب تک اس امر کا تعین نہ کرلے کہ اِن اشیاء کا مالک وہ خود ہے یا کوئی اور، اِن پر اُسکے اختیارات محدود ہیں یا غیر محدود، اور محدود ہیں تو حدود مقرر کرنے والا کون ہے؟ اسی طرح کیا وہ آپس میں اپنے ابنائے نوع کے ساتھ برتاؤ کی کوئی شکل متعین کرسکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کوئی رائے قائم نہ کرلے کہ انسانیت کس چیز سے عبارت ہے، انسان اور انسان کے درمیان فرق و امتیاز کی بنیاد کیا ہے، اور دوستی و دشمنی، اتفاق و اختلاف، تعاون اور عدم تعاون کی اساس کن

امور پر ہے؟ اسی طرح کیا وہ بحیثیت مجموعی اس دُنیا کے ساتھ کوئی رویّہ اختیار کر سکتا ہے جب تک اس معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچے کہ یہ نظامِ کائنات کس قسم کا ہے، اور اس میں میری کیا حیثیت ہے؟

جو مقدمہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اُسکی بنا پر بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام امور کے متعلق ایک نہ ایک رائے قائم کیے بغیر کوئی رویّہ اختیار کرنا غیر ممکن ہے۔ فی الواقع ہر انسان جو دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، اِن سوالات کے متعلق شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے اور رکھنے پر مجبور ہے، کیونکہ وہ اس رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص نے اِن سوالات پر فلسفیانہ غور و فکر کیا ہو اور واضح طور پر تنقیحات قائم کر کے ایک ایک سوال کا فیصلہ کیا ہو۔ نہیں، بہت سے آدمیوں کے ذہن میں اِن سوالات کی سرے سے کوئی متعین صورت ہوتی ہی نہیں۔ نہ وہ کبھی ان پر بالارادہ سوچتے ہیں۔ مگر باوجود اسکے ہر آدمی اجمالی طور پر ان سوالات کے متعلق منفی یا مثبت پہلو میں ایک رائے پر لازماً پہنچ جاتا ہے، اور زندگی میں اُس کا جو رویّہ بھی ہوتا ہے لازمی طور پر اُسی رائے کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بات جس طرح اشخاص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح جماعتوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ چونکہ یہ سوالات انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں اس لیے کوئی نظامِ تمدن و تہذیب اور حیاتِ اجتماعی کے لیے کوئی لائحہ بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان سوالات کا کوئی جواب متعین نہ کر لیا جائے۔ اور ان کا جو جواب بھی متعین کیا جائیگا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، اسی کی نوعیت کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی اور فی الجملہ پورا تمدن ویسا ہی رنگ اختیار کریگا جیسا اُس جواب کا مقتضا ہوگا۔ درحقیقت اس معاملہ میں کوئی تخلّف ممکن ہی نہیں ہے۔ خواہ ایک شخص کا رویہ ہو یا ایک سوسائیٹی کا، بہرحال وہ ٹھیک وہی نوعیت اختیار کریگا جو ان سوالات کے جواب کی نوعیت ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر آپ چاہیں تو ایک شخص یا ایک جماعت کے رویّہ کا تجزیہ کر کے بآسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس رویّہ کی تہ میں زندگی کے اِن بنیادی سوالات کا کونسا جواب کام کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعی محال ہے

کہ کسی شخصی یا اجتماعی رویّہ کی نوعیت کچھ ہو اور ان سوالات کے جواب کی نوعیت کچھ اور ہو۔ اختلاف زبانی دعوے اور واقعی رویّہ کے درمیان تو ضرور ہو سکتا ہے، لیکن ان سوالات کا جو جواب درحقیقت نفس کے اندر متمکن ہے اُسکی نوعیت اور عملی رویّہ کی نوعیت میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اچھا اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہیے۔ زندگی کے یہ بنیادی مسائل جنکے متعلق ابھی آپنے سُنا کہ ان کا کوئی حل اپنے ذہن میں متعین کیے بغیر آدمی دنیا میں ایک قدم نہیں چل سکتا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سب کے سب امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن کا کوئی جواب اُفق پر لکھا ہُوا نہیں ہے کہ ہر انسان دُنیا میں آتے ہی اسکو پڑھ لے۔ اور ان کا کوئی جواب ایسا بدیہی بھی نہیں ہے کہ ہر انسان کو خود بخود معلوم ہو جائے۔ اسی وجہ سے اِن کا کوئی ایک حل نہیں ہے جس پر سارے انسان متفق ہوں۔ بلکہ اِنکے بارے میں ہمیشہ انسانوں کے درمیان اختلاف رہا ہے اور ہمیشہ مختلف انسان مختلف طریقوں سے انکو حل کرتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اِنکو حل کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں، کیا صورتیں دُنیا میں اختیار کی گئی ہیں، اور ان مختلف صورتوں سے جو حل نکلتے ہیں وہ کس قسم کے ہیں؟

انکے حل کی ایک صُورت یہ ہے کہ آدمی اپنے حواس پر اعتماد کرے اور حواس سے جیسا کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کی بنا پر ان اُمور کے متعلق ایک رائے قائم کرلے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشاہدۂ حسی کے ساتھ وہم و قیاس کو ملا کر ایک نتیجہ اخذ کیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبروں نے حقیقت کا براہِ راست علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے اِن مسائل کا جو حل بیان کیا ہے اسکو قبول کر لیا جائے۔

دُنیا میں اب تک اِن مسائل کے حل کی یہی تین صورتیں اختیار کی گئی ہیں، اور غالباً یہی تین صورتیں ممکن بھی ہیں۔ اِن میں سے ہر صورت ایک جداگانہ طریقہ سے اِن مسائل کو حل کرتی ہے، ہر ایک حل سے ایک خاص قسم کا رویّہ وجود میں آتا ہے اور ایک خاص نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن بنتا ہے جو

اپنی بنیادی خصوصیات میں دوسرے تمام حلوں کے پیدا کردہ رویوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ان مختلف طریقوں سے ان مسائل کے کیا حل نکلے ہیں اور ہر ایک حل کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے۔

خالص جاہلیت

حواس پر اعتماد کر کے جب انسان ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اس طرز فکر کی عین فطرت کے تقاضے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامہ وجود و ظہور ہے جسکے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد نہیں۔ یونہی بن گیا ہے۔ یونہی چل رہا ہے۔ اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائیگا۔ اس کا کوئی مالک نظر نہیں آتا، لہذا وہ یا تو ہے ہی نہیں، یا اگر ہے تو انسان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو شائد اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اس کو کسی نے پیدا کیا یا یہ خود پیدا ہو گیا۔ بہرحال یہ سوال خارج از بحث ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے۔ کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے اسکی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قوتیں اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور اسکے گرد و پیش زمین کے دامن پر بے حد و حساب سامان پھیلا ہوا ہے جس پر یہ اپنے قویٰ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہذا اسکی قوتوں کا کوئی مصرف اسکے سوا نہیں کہ یہ اپنی خواہشات و ضروریات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرے۔ اور دنیا کی کوئی حیثیت اسکے سوا نہیں کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو اس لیے پھیلا ہوا ہے کہ انسان اس پر ہاتھ مارے۔ اوپر کوئی صاحب امر نہیں جسکے سامنے انسان جواب دہ ہو۔ اور نہ کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود ہے جہاں سے انسان کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہذا انسان ایک خود مختار اور غیر ذمہ دار ہستی ہے۔ اپنے لیے ضابطہ و قانون بنانا اور اپنی قوتوں کا مصرف تجویز کرنا، اور موجودات کے ساتھ اپنے طرز عمل کا تعین کرنا اس کا اپنا کام ہے۔

اسکے لیے اگر کوئی ہدایت ہے تو جانوروں کی زندگی میں، پتھروں کی سرگذشت میں، یا خود اپنی تاریخ کی تجربات میں ہے۔ اور یہ اگر کسی کے سامنے جوابدہ ہے تو آپ اپنے سامنے یا اُس اقتدار کے سامنے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیوی زندگی ہے اور اعمال کے سارے نتائج اسی زندگی کی حد تک ہیں۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائیگا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ ایک پورا نظریہ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا جواب حسی مشاہدہ پر دیا گیا ہے۔ اور اس جواب کا ہر جزو دوسرے جزو کے ساتھ کم از کم ایک منطقی ربط اور ایک مزاجی موافقت ضرور رکھتا ہے جسکی وجہ سے انسان دُنیا میں ایک ہموار و یکساں رویہ اختیار کر سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ جواب اور اس سے پیدا ہونے والا رویہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ اب اُس رویہ پر ایک نگاہ ڈالیے جو اس جواب کی بنا پر آدمی دُنیا میں اختیار کرتا ہے۔

انفرادی زندگی میں اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اوّل سے لے کر آخر تک خود مختارانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے جسم اور اپنی جسمانی قوتوں کا مالک سمجھیگا، اس لیے اپنے حسبِ منشا جس طرح چاہے گا اُنہیں استعمال کریگا۔ دُنیا کی جو چیزیں اسکے قبضہ قدرت میں آئیں گی اور جن انسانوں پر اسکو اقتدار حاصل ہوگا ان سب کے ساتھ وہ اس طرح برتاؤ کریگا جیسے کہ وہ ان کا مالک ہے۔ اسکے اختیارات کو محدود کرنے والی چیز صرف قوانینِ قدرت کی حدیں اور اجتماعی زندگی کی ناگزیر بندشیں ہوں گی۔ خود اُسکے اپنے نفس میں کوئی ایسا اخلاقی احساس — ذمہ داری کا احساس اور کسی بازپرس کا خوف — نہ ہوگا جو اسے شترِ بے مہار بننے سے روکتا ہو۔ جہاں خارجی رکاوٹیں نہ ہوں، یا جہاں وہ ان رکاوٹوں کے علی الرغم کام کرنے پر قادر ہو وہاں تو اسکے عقیدہ کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ ظالم، بددیانت، شریر اور مفسد ہو۔ وہ فطرتاً خود غرض،

مادہ پرست، اور ابن الوقت ہوگا اسکی زندگی کا کوئی مقصد اپنی نفسانی خواہشات اور حیوانی ضروریات کی خدمت کے سوا نہ ہوگا، اور اسکی نگاہ میں قدر و قیمت صرف اُن چیزوں کی ہوگی جو اُسکے اِس مقصدِ زندگی کے لیے کوئی قیمت رکھتی ہوں۔ افراد میں یہ سیرت و کردار پیدا ہونا اس عقیدے کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ بے شک یہ ممکن ہے کہ مصلحت اور دور اندیشی کی بنا پر ایسا شخص ہمدرد ہو، ایثار پیشہ ہو، اپنی قوم کی فلاح و ترقی کے لیے جان توڑ کوشش کرتا ہو، اور فی الجملہ اپنی زندگی میں ایک طرح کے ذمہ دارانہ اخلاق کا اظہار کرے۔ لیکن جب آپ اسکے اس رویہ کا تجزیہ کرینگے تو معلوم ہوگا کہ دراصل یہ اسکی خود غرضی و نفسانیت ہی کی توسیع ہے۔ وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کی بھلائی میں اپنی بھلائی دیکھتا ہے اس لیے اسکی بھلائی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص زیادہ سے زیادہ بس ایک نیشنلسٹ ہی ہو سکتا ہے۔

پھر جو سوسائیٹی اس ذہنیت کے افراد سے بنے گی اُسکی امتیازی خصوصیات یہ ہونگی: سیاست کی بنیاد انسانی حاکمیت پر قائم ہوگی، خواہ وہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کی حاکمیت ہو، یا جمہور کی حاکمیت۔ زیادہ سے زیادہ بلند اجتماعی تصور جو قائم کیا جا سکے گا وہ بس دولت مشترکہ (Common wealth) کا تصور ہوگا۔ اس مملکت میں قانون سارا انسان ہونگے۔ تمام قوانین خواہش اور تجربی مصلحت کی بنا پر بنائے اور بدلے جائینگے۔ اور منفعت پرستی و مصلحت پرستی ہی کے لحاظ سے پالیسیاں بھی بنائی اور بدلی جائیں گی۔ مملکت کے حدود میں وہ لوگ زور کر کے اُبھر آئینگے جو سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ چالاک، مکار، جھوٹے، دغاباز، سنگدل اور خبیث النفس ہونگے۔ سوسائیٹی کی رہنمائی اور مملکت کی زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوگی، اور انکی کتابِ آئین میں زور کا نام حق، اور بے زوری کا نام باطل ہوگا۔ تمدن و معاشرت کا سارا نظام نفس پرستی پر قائم ہوگا۔ لذاتِ نفس کی طلب ہر اخلاقی قید سے آزاد ہوتی چلی جائیگی، اور تمام اخلاقی معیار اس طرح قائم کیئے جائینگے کہ انکی وجہ سے لذتوں کے حصول میں کم سے کم

رکاوٹ ہو۔ اسی ذہنیت سے آرٹ اور لٹریچر متاثر ہونگے اور انکے اندر عُریانی و شہوانیت کے عناصر بڑھتے چلے جائینگے۔ معاشی زندگی میں کبھی جاگیرداری سسٹم برسرِ عروج آئیگا، کبھی سرمایہ داری نظام اسکی جگہ لیگا اور کبھی مزدور شورش کرکے اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کریں گے۔ عدل سے بہرحال معیشت کا رشتہ کبھی قائم نہ ہوسکیگا، کیونکہ دنیا اور اسکی دولت کے بارے میں اس سوسائٹی کے ہر فرد کا بنیادی رویہ اِس تصور پر مبنی ہوگا کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جس پر حسبِ منشاء اور حسبِ موقع ہاتھ مارنے کے لیے وہ آزاد ہے۔ پھر اس سوسائٹی میں افراد کو تیار کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم ہوگا اُسکا مزاج بھی اِسی تصورِ حیات اور اِسی رویہ کے مناسب حال ہوگا۔ اُس میں ہر نئی آنے والی نسل کو دنیا اور انسان، اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے متعلق وہی تصور دیا جائیگا جسکی تشریح میں نے اوپر کی ہے۔ تمام معلومات، خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے متعلق ہوں، اُن کو ایسی ہی ترتیب کے ساتھ دی جائینگی کہ آپ سے آپ اُنکے ذہن میں زندگی کا یہ تصور پیدا ہو جائے۔ اور پھر ساری تربیت اِس ڈھنگ کی ہوگی کہ وہ زندگی میں یہی رویہ اختیار کرنے اور اسی طرز کی سوسائٹی میں کھپ جانے کے لیے تیار ہوں۔ اس تعلیم و تربیت کی خصوصیات کے متعلق مجھے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آپ لوگوں کو اسکا ذاتی تجربہ ہے۔ جن درسگاہوں میں آپ تربیت پا رہے ہیں وہ سب اِسی نظریہ پر قائم ہوئی ہیں اگرچہ اُنکے نام اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ ہیں۔

یہ رویہ جسکی تشریح میں نے ابھی آپکے سامنے کی، خالص جاہلیت کا رویہ ہے۔ اسکی نوعیت وہی ہے جو اُس بچے کے رویے کی نوعیت ہے جو محض حسی مشاہدے پر اعتماد کرکے آگ کو ایک خوبصورت کھلونا سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اس مشاہدے کی غلطی فوراً تجربے سے ظاہر ہو جاتی ہے، کیونکہ جس آگ کو کھلونا سمجھ کر وہ دست اندازی کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ گرم آگ ہوتی ہے، ہاتھ لگاتے ہی فوراً بتا دیتی ہے کہ میں کھلونا نہیں ہوں۔ بخلاف اس کے یہاں مشاہدے کی غلطی بڑی دیر میں کھلتی ہے، بلکہ بہتوں پر کھلتی ہی نہیں، کیونکہ جس آگ پر یہ ہاتھ ڈالتے ہیں اُسکی آنچ دھیمی ہے، فوراً جَرکا نہیں دیتی

بلکہ صدیوں تک تپاتی رہتی ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص تجربات سے سبق لینے کے لیے تیار ہو تو شب و روز کی زندگی میں اس نظریہ کی بدولت افراد کی بے ایمانیوں، حکام کے مظالم، منصفوں کی بے انصافیوں، مالداروں کی خود غرضیوں، اور عام لوگوں کی بداخلاقیوں کا جو تلخ تجربہ اسکو ہوتا ہے، اور بڑے پیمانے پر اسی نظریہ سے قوم پرستی، امپیریلزم، جنگ، فساد، ملک گیری اور اقوام کشی کے جو شرارے نکلتے ہیں، اُنکے چرکوں سے وہ یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ رویہ جاہلیت کا رویہ ہے علمی رویہ نہیں ہے۔ کیونکہ انسان نے اپنے متعلق اور نظام کائنات کے متعلق جو رائے قائم کرکے یہ رویہ اختیار کیا ہے وہ امر واقعی کے مطابق نہیں ہے ورنہ اس سے یہ بُرے نتائج ظاہر نہ ہوتے۔

اب ہمیں دوسرے طریقہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم سے کام لیکر ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس طریقے سے تین مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں اور ہر ایک رائے سے ایک خاص قسم کا رویہ پیدا ہوا ہے:

شرک

۱- ایک رائے یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام بے خداوند تو نہیں ہے، مگر اسکا ایک خداوند (الٰہ یا رب) نہیں، بلکہ بہت سے خداوند (آلہہ اور ارباب) ہیں۔ کائنات کی مختلف قوتوں کا سررشتہ مختلف خداؤں کے ہاتھ میں ہے اور انسان کی سعادت و شقاوت، کامیابی و ناکامی، نفع و نقصان بہت سی ہستیوں کی مہربانی و نامہربانی پر منحصر ہے۔ یہ رائے جن لوگوں نے اختیار کی ہے اُنہوں نے پھر اپنے وہم و قیاس سے کام لیکر یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدائی کی طاقتیں کہاں کہاں اور کس کس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جن جن چیزوں پر بھی اُنکی نگاہ جاکر ٹھیری ہے اُنہی کو خدا مان لیا ہے۔

اس رائے کی بنا پر جو طرزِ عمل انسان اختیار کرتا ہے اسکی امتیازی خصوصیات یہ ہیں:

اوّلاً، اس سے آدمی کی پوری زندگی اوہام کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ وہ کسی علمی ثبوت کے

بغیر مجرد اپنے وہم و خیال سے بہت سی چیزوں کے متعلق یہ رائے قائم کرتا ہے کہ وہ فوق الفطری طریقوں سے اسکی قسمت پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ اس لیے وہ اچھے اثرات کی موہوم امید اور بُرے اثرات کے موہوم خوف میں مبتلا ہو کر اپنی بہت سی قوتیں لاحاصل طریقہ سے ضائع کر دیتا ہے۔ کہیں کسی قبر سے اُمید لگاتا ہے کہ یہ میرا کام کر دے گی۔ کہیں کسی بُت پر بھروسہ کرتا ہے کہ وہ میری قسمت بنا دے گا۔ کہیں کسی اور خیالی کارساز کو خوش کرنے کے لیے دوڑتا پھرتا ہے۔ کہیں کسی بُرے شگون سے دل شکستہ ہو جاتا ہے۔ اور کہیں کسی اچھے شگون سے توقعات کے خیالی قلعے بنا لیتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اسکے خیالات اور اسکی کوششوں کو فطری تدابیر کے راستہ سے ہٹا کر ایک بالکل غیر فطری راستہ پر ڈال دیتی ہیں۔

ثامنیاً، اس رائے کی وجہ سے پوجا پاٹ، نذر نیاز، اور دوسری رسموں کا ایک لمبا چوڑا دستور العمل بنتا ہے جس میں الجھ کر آدمی کی سعی و عمل کا ایک بڑا حصہ بے نتیجہ مشغولیتوں میں صرف ہو جاتا ہے۔

تاسعاً، جو لوگ اس مشرکانہ وہم پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں اُنکو بے وقوف بنا کر اپنے جال میں پھانس لینے کا چالاک آدمیوں کو خوب موقع مل جاتا ہے۔ کوئی بادشاہ بنکر بیٹھتا ہے اور سورج، چاند، یا دوسرے دیوتاؤں سے اپنا نسب ملا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہم بھی خداؤں میں سے ہیں اور تم ہمارے بندے ہو۔ کوئی پروہت یا مجاور بن بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا نفع و نقصان جن سے وابستہ ہے ان سے ہمارا تعلق ہے اور تم ہمارے ہی واسطے سے ان تک پہنچ سکتے ہو۔ کوئی پنڈت اور پیر بن جاتا ہے اور تعویذ گنڈوں اور منتروں اور عملیات کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہماری یہ چیزیں فوق الفطری طریقے سے تمہاری حاجتیں پوری کرینگی۔ پھر ان سب چالاک لوگوں کی نسلیں مستقل خاندانوں اور طبقوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جنکے حقوق، امتیازات، اور اثرات استداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور گہری بنیادوں پر جمتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس عقیدہ کی بدولت عام انسانوں کی گردنوں پر شاہی خاندانوں، مذہبی عہدہ داروں اور روحانی پیشواؤں کی خدائی کا جُوا مسلط ہوتا ہے اور یہ بناوٹی خدا اُنکو اس طرح اپنا خادم بناتے ہیں کہ گویا وہ اِنکے لیے دودھ دینے

اور سواری اور بار برداری کے جانور ہیں۔

رابعاً، یہ نظریہ نہ تو علوم و فنون، فلسفہ و ادب، اور تمدن و سیاست کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور نہ ان خیالی خداؤں سے انسانوں کو کسی قسم کی ہدایت ہی ملتی ہے کہ وہ اُسکی پابندی کریں۔ ان خداؤں سے تو انسان کا تعلق صرف اس حد تک محدود رہتا ہے کہ یہ اُنکی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کے لیے بس عبودیت کے چند مراسم ادا کردے۔ باقی رہے زندگی کے معاملات تو اُنکے متعلق قوانین اور ضوابط بنانا اور عمل کے طریقے معین کرنا انسان کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اس طرح مشرک سوسائٹی عملاً اُنہی سب راہوں پر چلتی ہے جنکا ذکر خالص جاہلیت کے سلسلہ میں ابھی میں آپ سے کرچکا ہوں۔ وہی اخلاق، وہی اعمال، وہی طرزِ تمدن، وہی سیاست، وہی نظامِ معیشت، اور وہی علم و ادب۔ اِن تمام حیثیتوں سے شرک کے رویے اور خالص جاہلیت کے رویہ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہوتا۔

رھبانیت

۲۔ دوسری رائے جو مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم کو ملا کر قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دُنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دار العذاب ہے۔ انسان کی روح ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے اس قفس میں بند کی گئی ہے۔ لذّات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں اصل میں یہ اس قیدخانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان جتنا اس دنیا اور اسکی چیزوں سے تعلق رکھے گا اتنا ہی ان زنجیروں میں پھنستا چلا جائیگا اور مزید عذاب کا مستحق ہوگا۔ نجات کی صُورت اِس کے سوا کوئی نہیں کہ زندگی کے سارے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے۔ خواہشات کو مٹایا جائے۔ لذات سے کنارہ کشی کی جائے۔ جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبوں کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے۔ اُن تمام محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے جو گوشت و خون کے تعلق سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اپنے اس دشمن یعنی نفس جسم کو مجاہدوں اور ریاضتوں سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اُس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح

ہلکی اور پاک صاف ہو جائیگی اور نجات کے بلند مقام پر اُڑنے کی طاقت حاصل کر لے گی۔

اس رائے سے جو رویہ پیدا ہوتا ہے اسکی خصوصیات یہ ہیں :-

اَوّلاً، اس سے انسان کے تمام رجحانات اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف اور تمدن سے وحشت کی طرف پھر جاتے ہیں۔ وہ دُنیا اور اُس کی زندگی سے مُنہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ذمہ داریوں سے بھاگتا ہے۔ اسکی ساری زندگی عدم تعاون اور ترک موالات کی زندگی بن جاتی ہے۔ اور اسکے اخلاق زیادہ تر سلبی (Negative) نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی بدولت نیک لوگ دُنیا کے کاروبار سے ہٹ کر اپنی نجات کی فکر میں گوشہ ہائے عزلت کی طرف چلے جاتے ہیں اور دُنیا کے سارے معاملات شریر لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں۔

ثالثاً، تمدن میں اس رائے کا اثر جس حد تک پہنچتا ہے اس سے لوگوں کے اندر سلبی اخلاقیات، غیر تمدنی (Anti-social) اور انفرادیت پسندانہ (Individualistic) رجحانات اور مایوسانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ انکی عملی قوتیں سرد ہو جاتی ہیں۔ وہ ظالموں کے لیے نرم نوالہ بن جاتے ہیں اور ہر جابر حکومت انکو آسانی سے قابو میں لا سکتی ہے۔ درحقیقت یہ نظریہ عوام کو ظالموں کے لیے ذلول (Tame) بنانے میں جادو کی تاثیر رکھتا ہے۔

رابعاً، انسانی فطرت سے اس راہبانہ نظریہ کی مستقل جنگ رہتی ہے اور اکثر یہ اُس سے شکست کھا جاتا ہے۔ پھر جب یہ شکست کھاتا ہے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے اِسے حیلوں کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے۔ کہیں عشق مجازی کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے اور کہیں ترکِ دُنیا کے پردے میں وہ دنیا پرستی کی جاتی ہے جسکے آگے دنیا پرست بھی شرما جائیں۔

ہمہ اوست

۳- تیسری رائے جو مشاہدے اور قیاس کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ انسان اور کائنات

اور کائنات کی تمام چیزیں بجائے خود غیر حقیقی ہیں۔ ان کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ دراصل ایک وجود نے ان ساری چیزوں کو خود اپنے ظہور کا واسطہ بنایا ہے اور وہی ان سب کے اندر کام کر رہا ہے۔ تفصیلات میں اس نظریہ کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مگر ان ساری تفصیلات کے اندر قدر مشترک یہی ایک خیال ہے کہ تمام موجودات ایک ہی وجود کا ظہور خارجی ہیں اور دراصل موجود وہی ہے باقی کچھ نہیں۔

اس نظریہ کی بنا پر جو رویہ انسان اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہونے ہی میں شک ہو جاتا ہے کجا کہ وہ کوئی کام کرے۔ وہ اپنے آپکو ایک ایسی کٹھ پتلی سمجھتا ہے جسے کوئی اور نچا رہا ہے یا جیسے کے اندر کوئی اور ناچ رہا ہے۔ وہ اپنے تخیلات کے نشے میں گم ہو جاتا ہے۔ اسکے لیے نہ کوئی مقصدِ زندگی ہوتا ہے اور نہ کوئی راہ عمل۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں خود تو کچھ ہوں ہی نہیں، نہ میرے کرنے کا کوئی کام ہے، نہ میرے کیے سے کچھ ہو سکتا ہے۔ اصل میں تو وہ وجودِ کلی جو مجھ میں اور تمام کائنات میں سرایت کیے ہوئے ہے اور جو ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہے، سارے کام اسی کے ہیں اور وہی سب کچھ کرتا ہے۔ وہ اگر مکمل ہے تو میں بھی مکمل ہوں، پھر کوشش کس چیز کے لیے؟ اور وہ اگر اپنی تکمیل کے لیے کوشاں ہے تو جس عالم گیر حرکت کے ساتھ وہ کمال کی طرف جا رہا ہے اُسی پیٹ میں ایک جزء کی حیثیت سے میں بھی آپ سے آپ چلا جاؤنگا۔ میں ایک جزء ہوں، مجھے کیا خبر کہ کُل کدھر جا رہا ہے اور کدھر جانا چاہتا ہے؟

اس طرزِ خیال کے عملی نتائج قریب قریب وہی ہیں جو ابھی میں نے راہبانہ نظریہ کے سلسلہ میں بیان کیے ہیں۔ بلکہ بعض حالات میں اس رائے کو اختیار کرنے والے کا طرزِ عمل اُن لوگوں کے رویہ سے ملتا جلتا ہوتا ہے جو خالص جاہلیت کا نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اپنی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے اور پھر جدھر خواہشات لے جاتی ہیں اس طرف یہ سمجھتے ہوئے بے تکلف چلا جاتا ہے کہ جانے والا وجود کلی ہے نہ کہ میں۔

پہلے نظریہ کی طرح یہ تینوں نظریے بھی جاہلیت کے نظریے ہیں۔ اور اس بنا پر جو رویے ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی جاہلیت ہی کے رویے ہیں۔ اس لیے کہ اول تو ان میں سے کوئی نظریہ بھی کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیالی اور قیاسی بنیادوں پر مختلف رائیں قائم کر لی گئی ہیں۔ دوسرے انکا واقعہ کے خلاف ہونا تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی رائے بھی امر واقعی کے مطابق ہوتی تو اس کے مطابق عمل کرنے سے بُرے نتائج تجربے میں نہ آتے۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز کو جہاں کہیں انسان نے کھایا اُسکے پیٹ میں درد ضرور ہوا، تو اس تجربے سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فی الواقع معدہ کی جو ساخت ہے اور جو اُسکی طبیعت ہے، یہ چیز اس کے مطابق نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جب یہ حقیقت ہے کہ شرک، رہبانیت اور وجودیت کے نظریے اختیار کرنے سے انسان کو بحیثیت مجموعی نقصان ہی پہنچا تو یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی واقعہ اور حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔

اسلام

اب ہمیں تیسری صورت کو لینا چاہیے جو زندگی کے ان بنیادی مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے کی آخری صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ پیغمبروں نے ان مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اُسے قبول کیا جائے۔

اس طریقہ کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی اجنبی مقام پر آپ ہوں اور آپکو خود اُس مقام کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہو تو آپ کسی دُوسرے شخص سے دریافت کریں اور اُسکی راہ نمائی میں وہاں کی سیر کریں۔ ایسی صورتِ حال جب پیش آتی ہے تو آپ پہلے اُس شخص کو تلاش کرتے ہیں جو خود واقف کار ہونیکا دعویٰ کرے، پھر آپ قرائن سے اس امر کا اطمینان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ شخص قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، پھر آپ اس کی راہ نمائی میں چل کر دیکھتے ہیں، اور جب تجربہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسکی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جو عمل آپ نے کیا اس سے کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلا تو آپکو پوری طرح اطمینان ہو جاتا ہے کہ واقعی وہ شخص واقف کار تھا اور اس جگہ کے متعلق جو معلومات اُس نے دی تھیں وہ صحیح تھیں۔

یہ ایک علمی طریقہ ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا طریق علمی ممکن نہ ہو تو پھر رائے قائم کرنے کے لیے یہی ایک صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔

اب دیکھیے دُنیا آپ کے لیے ایک اجنبی جگہ ہے۔ آپکو نہیں معلوم کہ اسکی حقیقت کیا ہے، اس کا انتظام کس قسم کا ہے، کس آئین پر یہ کارخانہ چل رہا ہے، اسکے اندر آپکی کیا حیثیت ہے، اور یہاں آپکے لیے کیا رویہ مناسب ہے۔ آپنے پہلے یہ رائے قائم کی کہ جیسا بظاہر نظر آتا ہے اصل حقیقت بھی وہی ہے۔ آپ نے اس رائے پر عمل کیا مگر نتیجہ غلط نکلا۔ پھر آپنے قیاس اور گمان کی بنا پر مختلف رائیں قائم کیں اور ہر ایک پر عمل کر کے دیکھا مگر ہر صورت میں نتیجہ غلط ہی رہا۔ اس کے بعد آخری صورت یہی ہے کہ آپ پیغمبروں کی طرف رجوع کریں۔ یہ لوگ واقف کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اِنکے حالات کی جتنی چھان بین کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سچے، نہایت امین، نہایت نیک، نہایت بے غرض، اور نہایت صحیح الدماغ لوگ ہیں۔ لہٰذا بادی النظر میں اُن پر اعتماد کرنے کے لیے کافی وجہ موجود ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا کے متعلق اور دنیا میں آپکی حیثیت کے متعلق جو معلومات وہ دیتے ہیں وہ کہاں تک لگتی ہوئی ہیں، ان کے خلاف کوئی عملی ثبوت تو نہیں ہے، اور انکے مطابق جو رویہ دنیا میں اختیار کیا گیا وہ تجربہ سے کیسا ثابت ہوا۔ اگر تحقیق سے ان تینوں باتوں کا جواب بھی اطمینان بخش نکلے تو ان کی راہ نمائی پر ایمان لے آنا چاہیے اور زندگی میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہیے جو اس نظریہ کے مطابق ہو۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا پچھلے جاہلیت کے طریقوں کے مقابلہ میں یہ طریقہ علمی طریقہ ہے۔ اور اگر اس علم کے آگے آدمی سر تسلیم خم کر دے، اگر خود سری اور خود رائی چھوڑ کر اس علم کا اتباع کرے، اور اپنے رویہ کو اپنی حدود کا پابند بنا دے جو اس علم نے قائم کی ہیں تو اسی طریقہ کا نام اسلامی طریقہ ہے۔

انبیاء کا نظریۂ کائنات و انسان

پیغمبر کہتے ہیں:

یہ سارا عالم ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزو انسان بھی ہے کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں ہے بلکہ ایک منظم، باضابطہ سلطنت ہے۔ اللہ نے اسکو بنایا ہے یہی اس کا مالک ہے۔ اور وہی اس کا اکیلا حاکم ہے۔ یہ ایک کلی نظام (Totalitarian System) ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں ہیں۔ اُس مقتدر اعلیٰ کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو نظام عالم میں کام کر رہی ہیں، اُسی کے زیر حکم ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے، یا اس کے اذن کے بغیر اپنے اختیار سے کوئی حرکت کرے۔ اس ہمہ گیر سسٹم کے اندر کسی کی خود مختاری (Independence) اور غیر ذمہ داری (Irresponsibility) کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ فطرۃً ہو سکتی ہے۔

انسان یہاں پیدائشی رعیت (Born subject) ہے، رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اسکے امکان میں نہیں ہے، لہٰذا یہ خود اپنے لیے طریق زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

یہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے کہ اپنی ملک میں تصرف کرنے کا ضابطہ خود بنائے۔ اس کا جسم اور اس کی ساری قوتیں اللہ کی ملک اور اُس کا عطیہ ہیں، لہٰذا یہ اُن کو خود اپنے منشاء کے مطابق استعمال کرنے کا حق دار نہیں ہے، بلکہ جس نے یہ چیزیں اسکو عطا کی ہیں اُسی کی مرضی کے مطابق اسے اُنکو استعمال کرنا چاہیے۔

اسی طرح جو اشیاء اس کے گرد و پیش دنیا میں پائی جاتی ہیں، زمین، جانور، پانی، نباتات، معدنیات وغیرہ، یہ سب اللہ کی ملک ہیں، انسان انکا مالک نہیں ہے، لہٰذا انسان کو ان پر بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اسے انکے ساتھ اُس قانون کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے جو اصل مالک نے مقرر کیا ہے۔

اسی طرح وہ تمام انسان بھی جو زمین پر بستے ہیں، اور جنکی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے

اللہ کی رعیت ہیں۔ لہٰذا انکو اپنے باہمی تعلقات کے بارے میں خود اصول اور ضابطے مقرر کرنیکا حق نہیں ہے۔ اُنکے جملہ تعلقات خدا کے بنائے ہوئے قانون پر مبنی ہونے چاہئیں۔

رہی یہ بات کہ وہ خدا کا قانون کیا ہے؟ تو پیغمبر یہ کہتے ہیں کہ جس ذریعۂ علم کی بنا پر ہم تمہیں دُنیا کی اور خود تمہاری یہ حقیقت بتا رہے ہیں، اُسی ذریعۂ علم سے ہم کو خدا کا قانون بھی معلوم ہوا ہے۔ خدا نے خود ہم کو یہ علم دیا ہے اور ہمکو اس بات پر مامور کیا ہے کہ یہ علم تم تک پہنچا دیں۔ لہٰذا تم ہم پر اعتماد کرو۔ ہمیں اپنے بادشاہ کا نمائندہ تسلیم کرو۔ اور ہم سے اس کا مستند قانون لو۔

پھر پیغمبر ہم سے کہتے ہیں کہ یہ جو تم بظاہر دیکھتے ہو کہ سلطنت عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے نہ اُسکے کارپرداز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور یہ جو تم ایک طرح کی خود مختاری اپنے اندر محسوس کرتے ہو کہ جس طرح چاہو کام کرو، مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتے ہو، اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتے ہو، ہر صورت میں تم کو رزق ملتا ہے، وسائل کار بہم پہنچتے ہیں، اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی، یہ سب دراصل تمہاری آزمائش کے لیے ہے۔ چونکہ تم کو عقل، قوت مشاہدہ، قوت استنباط، اور قوت انتخاب دی گئی ہے، اِس لیے مالک نے اپنے آپکو اور اپنے نظام سلطنت کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم اپنی اِن قوتوں سے کس طرح کام لیتے ہو۔ اس نے تم کو انتخاب کی آزادی (Freedom of choice) دی ہے اور سمجھ بوجھ عطا کی ہے۔ اگر تم اپنی رعیت ہونے کی حیثیت کو سمجھو، اور برضا و رغبت اس حیثیت کو اختیار کرو، بغیر اسکے کہ تم پر اس حیثیت میں رہنے کے لیے کوئی جبر ہو، تو اپنے مالک کی آزمائش میں کامیاب ہو گے۔ اور اگر رعیت ہونے کی حیثیت کو نہ سمجھو، یا سمجھنے کے باوجود باغیانہ روش اختیار کرو تو امتحان میں ناکام ہو جاؤ گے۔ اسی امتحان کی غرض سے تم کو دنیا میں کچھ اختیارات دیے گئے ہیں، دنیا کی بہت سی چیزیں تمہارے قبضہ قدرت میں دی

گئی ہیں، اور تم کو عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے۔

اسکے بعد پیغمبر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی چونکہ امتحان کی مہلت ہے لہٰذا یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا[۱]۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ کسی عمل نیک کا انعام نہیں ہے۔ وہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے۔ بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے۔ مال، دولت، اولاد، خدام، حکومت، اسباب زندگی، یہ سب چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تاکہ تم ان پر کام کرکے دکھاؤ اور اپنی اچھی یا بری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکلیفیں، نقصانات، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں

---

[۱] اس سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں دراصل عالم طبیعی ہے نہ کہ عالم اخلاقی۔ جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں ہیں بلکہ طبیعی قوانین ہیں۔ اسلیے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر مترتب ہو سکتے ہیں تو صرف اُسی حد تک جس حد تک کہ قوانین طبیعی ان کو مترتب ہونے کا موقع دیں، ورنہ جہاں قوانین طبیعی ان کے ظہور کے لیے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس فعل کے اخلاقی نتیجہ کا مترتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی اُس کا سراغ لگنے اور اسکے اوپر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہونے میں مددگار ہوں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مترتب ہوگا ہی نہیں۔ اور اگر وہ سازگاری کر بھی لیں، تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مترتب نہ ہو سکینگے، کیونکہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کر دیا جانا اُس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا اس نے ارتکاب کیا تھا۔ اسی لیے یہ دنیا دارالجزاء نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی۔ دارالجزاء ہونے کے لیے ایک ایسا نظام عالم درکار ہے جس میں موجودہ نظام عالم کے برعکس حکمراں قوانین قوانینِ اخلاقی ہوں اور قوانین طبیعی محض انکے خادم کی حیثیت رکھتے ہوں۔

بلکہ ان میں سے بعض قانون فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں[۱]، اور بعض آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں[۲]، اور بعض اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قائم کرکے جب تم ایک رویہ اختیار کرتے ہو تو لامحالہ تم کو چوٹ لگتی ہے[۳]۔ بہرحال یہ دُنیا دارالجزا نہیں ہے بلکہ دارالامتحان ہے۔ یہاں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، قابلِ اخذ، یا قابلِ ترک ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ مہلت کی زندگی ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تمہارے پورے کارنامے کو جانچ کر فیصلہ کیا جائیگا کہ تم امتحان میں کامیاب ہوئے ہو یا ناکام۔ اور وہاں جس چیز پر کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً تم نے اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالےٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اسکی طرف سے آئی ہوئی تعلیم و ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانا یا نہیں، اور ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد آزادی انتخاب رکھنے کے باوجود تم نے اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے حکم شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا یا نہیں۔

---

[۱] مثلاً زنا کرنے والے کا بیماری میں مبتلا ہونا، کہ یہ اس گناہ کی اخلاقی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا طبیعی نتیجہ ہے۔ اگر وہ علاج کرنے میں کامیاب ہو جائے تو بیماری سے بچ جائیگا مگر اخلاقی سزا سے نہ بچے گا۔ اگر توبہ کرے تو اخلاقی سزا سے بچ جائیگا مگر بیماری دور نہ ہوگی۔

[۲] مثلاً کسی شخص کا افلاس میں مبتلا ہونا اسکے حق میں اس امر کی آزمائش ہے کہ وہ اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے یا جائز وسائل ہی سے کام لینے پر ثابت قدم رہتا ہے، اور مصائب کے ہجوم میں وہ حق پرستی پر قائم رہتا ہے یا مضطرب ہو کر باطل کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔

[۳] مثلاً جب انسان اس دنیا کو بے خدا اور اپنے آپکو خود مختار سمجھ کر کام کرتا ہے تو چونکہ فی الواقع نہ دنیا بے خدا ہے اور نہ انسان خود مختار، اسلیے امر واقعی کے خلاف عمل کرنیکی وجہ سے وہ لامحالہ چوٹ کھاتا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے آگ کو کھلونا سمجھ کر آپ ہاتھ میں پکڑ لیں تو ہاتھ جل جائیگا کیونکہ آپنے امر واقعی کے خلاف رویہ اختیار کیا۔

نظریۂ اسلامی کی تنقید

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو پیغمبروں نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہ ہے۔ اسکے تمام اجزاء میں ایک منطقی ربط ہے۔ کوئی جزو دوسرے جزو سے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثار کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز بھی مشاہدہ یا تجربہ میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریہ سے نہ کی جاسکتی ہو۔ لہٰذا یہ علمی نظریہ (Scientiffc theory) کی تعریف میں آتا ہے۔ پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ ٹوٹ جاتا ہو۔ لہذا یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ٹوٹے ہوئے نظریات میں اسکو شمار نہیں کیا جاسکتا۔

پھر نظام عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اُس سے یہ نظریہ نہایت اغلب (Most probable) نظر آتا ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اُسکو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرینِ دانش ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے، بہ نسبت اسکے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور ایک ہی مختار کُل اس کا ناظم ہے، بہ نسبت اسکے کہ یہ لامرکزی نظام ہے اور بہت سے ناظموں کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور بامقصد نظام ہے، بہ نسبت اسکے کہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظام کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جز ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول (Most reasonable) نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بالکل ایک قابلِ عمل (Practicable) نظریہ

ہے۔ زندگی کی ایک پوری اسکیم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریہ پر مبنی ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے لیے، علوم و فنون کے لیے، ادب اور ہنر کے لیے، تمدن و معاشرت کے لیے، معیشت اور کاروبار کے لیے، سیاست اور انتظامِ مملکت کے لیے، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لیے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ہر ضرورت کے لیے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبۂ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لیے اس نظریہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اب ہمیں صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اس نظریہ سے دنیا کی زندگی میں کس قسم کا رویہ بنتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

انفرادی زندگی میں یہ نظریہ دوسرے جاہلی نظریات کے برعکس ایک نہایت ذمہ دارانہ اور نہایت منضبط (Well-disciplined) رویہ پیدا کرتا ہے۔ اس نظریہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور اسکی طاقتوں کو اور دنیا اور اسکی کسی چیز کو بھی اپنی ملک سمجھ کر خود مختارانہ استعمال نہ کرے بلکہ خدا کی ملک سمجھ کر صرف اُسکے قانون کی پابندی میں استعمال کرے۔ ہر چیز کو جو اسے حاصل ہے خدا کی امانت سمجھے اور یہ سمجھتے ہوئے اس میں تصرف کرے کہ مجھے اس امانت کا پورا حساب دینا ہے، اور حساب بھی اسکو دینا ہے جسکی نظر سے میرا کوئی فعل بلکہ کوئی دل میں چھپا ہوا ارادہ تک پوشیدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہر حال میں ایک ضابطہ کا پابند ہوگا۔ وہ خواہشات کی بندگی میں کبھی شتر بے مہار نہیں بن سکتا۔ وہ ظالم اور خائن نہیں ہو سکتا۔ اُسکی سیرت پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ضابطہ کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے نفس میں ایک زبردست اخلاقی انضباط پیدا ہو جاتا ہے جو اُسے اُن مواقع پر بھی راستی اور حق پر قائم رکھتا ہے جہاں اُسے کسی دنیوی طاقت کی بازپرس کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ خدا کا خوف اور امانت کا احساس وہ چیز ہے جس سے بڑھ کر سوسائیٹی کو قابلِ اعتماد افراد فراہم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تصور میں نہیں آسکتا۔

مزید برآں یہ نظریہ آدمی کو نہ صرف سعی و جہد کا آدمی بناتا ہے بلکہ اسکی سعی و جہد کو خود غرضی، نفس پرستی، یا قوم پرستی کے بجائے حق پرستی اور بلند تر اخلاقی مقاصد کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ میں دنیا میں بے کار نہیں آیا ہوں بلکہ خدا نے مجھے کام کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، اور میری زندگی اپنے لیے یا اپنے دوسرے متعلقین کے لیے نہیں ہے بلکہ اُس کام کے لیے ہے جس میں خدا کی رضا ہو، اور میں یونہی چھوڑا نہ جاؤنگا بلکہ مجھ سے پورا حساب لیا جائیگا کہ میں نے اپنے وقت کا اور اپنی قوتوں کا کتنا اور کس طرح استعمال کیا، ایسے شخص سے زیادہ کوشش کرنے والا اور نتیجہ خیز اور صحیح کوشش کرنے والا آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ نظریہ ایسے بہتر افراد پیدا کرتا ہے کہ ان سے بہتر انفرادی رویہ کا تصور کرنا مشکل ہے۔

اب اجتماعی پہلو میں دیکھیے۔

سب سے پہلے تو یہ نظریہ انسانی اجتماع کی بنیاد بدل دیتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تمام انسان خدا کی رعیت ہیں۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے سب کے حقوق یکساں، سب کی حیثیت یکساں، اور سب کے لیے مواقع یکساں۔ کسی شخص، کسی خاندان، کسی طبقہ، کسی قوم، کسی نسل کے لیے دوسرے انسانوں پر نہ کسی قسم کی برتری و فوقیت ہے نہ امتیازی حقوق۔ اس طرح انسان پر انسان کی حاکمیت اور فضیلت کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور وہ تمام خرابیاں یک لخت دور ہو جاتی ہیں جو بادشاہی، جاگیرداری، نوابی (Aristocracy) اور برہمنیت و پاپائیت سے پیدا ہوتی ہیں۔

پھر یہ چیز قبائلی، قومی، نسلی، جغرافی اور لونی تعصبات کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے جنکی بدولت دنیا میں سب سے زیادہ خوں ریزیاں ہوئی ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے تمام روئے زمین خدا کا ملک ہے، تمام انسان آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں، اور فضیلت کی بنیاد نسل و نسب، مال و دولت یا رنگ کی سپیدی و سرخی پر نہیں بلکہ اخلاق کی پاکیزگی اور خدا کے خوف پر ہے۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے

والا اور صلاح و تقوی پر عمل کرنے والا ہے وہی سب سے افضل ہے۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی ربط و تعلق یا فرق و امتیاز کی بنا بھی اس نظریہ میں کلیتہً تبدیل کر دی گئی ہے۔ انسان نے اپنی ایجاد سے جن چیزوں کو اجتماع و افتراق کی بنا ٹھیرایا ہے وہ انسانیت کو بے شمار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور ان حصوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں کیونکہ نسل، یا وطن، یا قومیت یا رنگ وہ چیزیں نہیں ہیں جنکو آدمی تبدیل کر سکتا ہو اور ایک گروہ میں سے دوسرے گروہ میں جا سکتا ہو۔ برعکس اسکے یہ نظریہ انسان اور انسان کے درمیان اجتماع و افتراق کی بنا خدا کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی پر رکھتا ہے۔ جو لوگ مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کر لیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا واحد قانون تسلیم کریں وہ سب ایک جماعت ہیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ دوسری جماعت۔ اس طرح تمام اختلافات مٹ کر صرف ایک اختلاف باقی رہ جاتا ہے اور وہ اختلاف بھی قابل عبور ہے۔ کیونکہ ہر وقت ایک شخص کے لیے ممکن ہے کہ اپنا عقیدہ اور طرز زندگی بدل دے اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جائے۔

اِن تمام بنیادی اصلاحات کے بعد جو سوسائیٹی اِس نظریہ پر بنتی ہے اُسکی ذہنیت، اسپرٹ اور اجتماعی تعمیر (Social structure) بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں اسٹیٹ انسان کی حاکمیت پر نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت پر مبنی ہے۔ حکومت خدا کی ہوتی ہے، قانون خدا کا ہوتا ہے، اور انسان صرف خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ چیز اول تو ان ساری خرابیوں کو دور کر دیتی ہے جو انسان پر انسان کی حکومت اور انسان کی قانون سازی سے پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ایک عظیم الشان فرق جو اس نظریہ پر اسٹیٹ بننے سے واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کے پورے نظام میں عبادت اور تقویٰ کی اسپرٹ پھیل جاتی ہے۔ راعی اور رعیت دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی حکومت میں ہیں اور ہمارا معاملہ براہِ راست اُس خدا سے ہے جو عالم الغیب و الشہادہ ہے۔ ٹیکس دینے والا یہ سمجھ کر

ٹیکس دیتا ہے کہ وہ خدا کو ٹیکس دے رہا ہے، اور ٹیکس لینے والے اور اس ٹیکس کو خرچ کرنے والے یہ سمجھتے ہوئے کام کرتے ہیں کہ یہ مال خدا کا مال ہے اور ہم امین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی سے لے کر ایک جج اور گورنر تک ہر کارندۂ حکومت اپنی ڈیوٹی اُسی ذہنیت کے ساتھ انجام دیتا ہے جس ذہنیت کے ساتھ وہ نماز پڑھتا ہے۔ دونوں کام اسکے لیے یکساں عبادت ہیں۔ اور دونوں میں وہی ایک تقویٰ اور خشیت کی روح درکار ہے۔ باشندے اپنے اندر سے جن لوگوں کو خدا کی نیابت کا کام انجام دینے کے لیے چنتے ہیں اُن میں سب سے پہلے جو صفت تلاش کی جاتی ہے وہ خوفِ خدا اور امانت و صداقت کی صفت ہے۔ اس طرح سطح پر وہ لوگ اُبھر کر آتے ہیں اور اختیارات اُنکے ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں جو سوسائٹی میں سب سے بہتر اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

تمدن و معاشرت میں بھی یہ نظریہ وہی تقویٰ اور طہارت اخلاق کی اسپرٹ پھیلا دیتا ہے۔ اس میں نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی ہوتی ہے، ہر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خدا کا واسطہ حائل ہوتا ہے، اور خدا کا قانون دونوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ قانون چونکہ اس نے بنایا ہے جو تمام نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے پاک ہے، اور علیم و حکیم بھی ہے، اس لیے اس میں فتنے کا ہر دروازہ اور ظلم کا ہر راستہ بند کیا گیا ہے اور انسانی فطرت کے ہر پہلو اور اسکی ہر ضرورت کی رعایت کی گئی ہے۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ میں اُس پُوری اجتماعی عمارت کا نقشہ پیش کروں جو اس نظریہ پر بنتی ہے۔ مگر جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اُس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبروں نے جو نظریہ کائنات و انسان پیش کیا ہے وہ کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ یہ محض کاغذ پر ایک خیالی نقشہ (Utopia) ہو، بلکہ تاریخ میں اس نظریہ پر ایک اجتماعی نظام اور ایک اسٹیٹ بنا کر دکھایا جا چکا ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ جیسے

افراد اس نظریہ پر تیار کیے گئے تھے نہ اُن سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے اور نہ اُس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔ اس کے افراد میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک صحرائی عورت کو زنا سے حمل ہو جاتا ہے، وہ جانتی ہے کہ اس جرم کی سزا سنگساری جیسی ہولناک سزا ہے، مگر وہ خود چل کر آتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اس پر سزا نافذ کی جائے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وضع حمل کے بعد آئیو اور بغیر کسی مچلکہ و ضمانت کے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وضع حمل کے بعد وہ پھر صحرا سے آتی ہے اور سزا دیئے جانے کی درخواست کرتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ بچہ کو دودھ پلا اور جب دودھ پلانے کی مدت ختم ہو جائے تب آئیو۔ پھر وہ صحرا کی طرف واپس چلی جاتی ہے اور کوئی پولیس کی نگرانی اس پر نہیں ہوتی۔ رضاعت کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ پھر آکر التجا کرتی ہے کہ اب اسے سزا دے کر اُس گناہ سے پاک کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہو چکا ہے۔ چنانچہ اُسے سنگسار کیا جاتا ہے، اور جب وہ مر جاتی ہے تو اُس کے لیے دعائے رحمت کی جاتی ہے، اور جب ایک شخص کی زبان سے اس کے حق میں اتفاقاً یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ کیسی بے حیا عورت تھی تو جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ خدا کی قسم اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔ یہ تو اس سوسائٹی کے افراد کا حال تھا۔ اور اس اسٹیٹ کا حال یہ تھا کہ جب حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے تک پہنچی ہوئی تھی، اور جس کے خزانے ایران و شام و مصر کی دولت سے معمور ہو رہے تھے اس کا صدر صرف ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ تنخواہ لیتا تھا اور اس کے شہریوں میں ڈھونڈے سے بھی بمشکل کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خیرات لینے کا مستحق ہو۔

اس تجربہ کے بعد بھی اگر کسی شخص کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ انبیاء نے نظام کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ حق ہے تو ایسے شخص کے اطمینان کے

سے یہ کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے، کیونکہ خدا اور فرشتوں اور آخرت کی زندگی کا براہِ راست عینی مشاہدہ تم سے بہرحال حاصل نہیں ہو سکتا۔ جہاں مشاہدہ ممکن نہ ہو وہاں تجربہ سے بڑھ کر صحت کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طبیب بیمار کے اندر مشاہدہ کر کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی الواقع سسٹم میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے تو وہ مختلف دوائیں دے کر دیکھتا ہے۔ اور جو دوا اس اندھیری کوٹھڑی میں ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھتی ہے اُس کا مرض کو دور کر دینا ہی اس بات پر قطعی دلیل ہوتا ہے کہ سسٹم میں فی الواقع جو خرابی تھی یہ دوا اُسکے عین مطابق تھی۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کی کل کسی دوسرے نظریہ سے درست نہیں ہوتی اور صرف انبیاء کے نظریہ ہی سے درست ہوتی ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ حقیقت کے مطابق ہے، فی الواقع یہ کائنات اللہ کی سلطنت ہی ہے اور واقعی اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے جس میں انسان کو اپنے کارنامۂ حیاتِ دنیوی کا حساب دینا ہے۔

ضرورت مترجمین

عربی۔ فارسی۔ انگریزی سے براہِ راست شستہ و رفتہ سلیس اردو میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ جو مناسب اجرت پر علمی ادبی تاریخی نیز متفرق علوم و فنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کر سکیں۔ کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے۔ علمی قابلیت نیز تجربہ کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے

پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں:

شباب۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۲۶ بمبئی نمبر ۳